قسط ۲۱

ہندوتہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

شاہ جہاں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر حاضر ہوا۔ خراج عقیدت پیش کرنیکے بعد اس نے اپنی، حاجت پیش کی اس دعا کا نتیجہ دارا شکوہ کی ولادت سے ظاہر ہوا ان واقعات سے عوام کا متاثر ہونا ناگزیر تھا اس بنا پر انہوں نے مزارات کو اپنی حاجت روائی کا ایک واحد اور قوی ذریعہ بنالیا اور اس معاملہ میں حاکم و محکوم امیر و، غریب عوام و خواص میں کوئی بیّن تفاوت نہ رہا۔ اگر اکبر بادشاہ سے ایسے اعمال و افعال ظہور میں آتے تو شاید لوگوں میں اتنا گہرا اثر نہ پڑتا کیونکہ اس کے مذہبی عقائد اور دینی بے راہ روی نے خواص و عوام دونوں کو اس کی طرف سے مشکوک کردیا تھا اور غالباً خواص اس کی تقلید نہ کرتے۔ مگر جہانگیر اور شاہ جہاں کے جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے زیر اثر حامئ دین و شریعت تھے ان افعال نے عوام و خواص دونوں کو گور پرستی کی طرف رجوع کردیا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں سے ایسے افعال کا سرزد ہونا' دیگر وجوہ کے علاوہ اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ انکی رگوں میں اسلامی خون سے کہیں زیادہ ہندوستانی خون موج زن تھا مزید براں شاہی محلات کے جہاں ان کی پرورش ہندو ماؤں اور خادماؤں کی گود میں ہوئی تھی، در و دیوار سے ہندوستانی رسم و رواج اور مذہبی عقائد کی خوشبو ہوا میں پھیل کر دور دور تک لوگوں کے دماغوں کو معطر کررہی تھی اور اسی ماحول میں جہانگیر اور شاہ جہاں نے سانس لی ان کی نس نس میں ہندوانہ سماجی اور مذہبی عناصر سرایت کرگئے تھے۔

اورنگ زیب کی دینی تعلیم بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ سن بلوغیت ہی سے مذہب کی طرف اس کا بے حد رجحان تھا اور عام طور پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنے افعال کو ترتیب دیتا تھا ساتھ ساتھ اکبر، جہانگیر اور بعض داراشکوہ کے مذہبی عقائد کے خلاف جو ندار کی تحریک چل رہی تھی اس نے بھی اورنگ زیب کو بہت متاثر کیا تھا وہ خواجہ معصوم[1] کا مرید بھی تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور اخلاق کی درستی کے لیئے پوری جد وجہد کی اور فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کرا کر ایک گرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی۔[2] لیکن اس کی وفات کے بعد اس کے نا اہل اور عیش پرست جانشینوں کے عہد میں وہ کوششیں خاک میں مل گئیں اور وہ نظام منہدم ہونے لگا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مسلمانان ہند کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔ "اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مسلمانان ہند کی مذہبی اور اخلاقی حالت انتہائی زبوں تھی۔ فکر و عمل، اخلاق و عادات۔ کردار و اطوار سب پر انحطاط کا رنگ چھایا ہوا تھا... اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی اور سماجی نظام کا ڈھانچہ بگڑ رہا تھا۔"[3]

چونکہ اورنگ زیب کے جانشیں مغلیہ بادشاہوں کے مذہبی عقائد پر بوضاحت روشنی ڈالنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے لہٰذا صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان بادشاہوں کی نظر اسلام کے بنیادی اصولوں کو کوئی خاص اہمیت

---

[1] آپ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے منجھلے صاحبزادہ اور خلیفہ تھے آپ قطب الوقت اور مرشد عصر تھے والد سے روحانی تربیت حاصل کی تھی انکے حلقہ ارادت میں بے شمار اہل عرب اور عجم تھے۔ داراشکوہ کو اس خاندان سے دلی عداوت تھی اور ان افراد کو ستانے کے درپے رہتا تھا مگر اللہ کی استمداد انکا بال بیکا نہ کرسکا شیخ معصوم کا وصال ۷۹/۱۰ھ ۱۶۶۹-۱۶۶۸ء میں ہوا تھا مزار سرہند شریف میں والد بزرگوار کے مزار کے قریب ہے برائے تفصیل ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیا ۱/ص ۶۳۹-۶۴۲، رود کوثر ص ۴۹۰

[2] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۵۴

[3] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۵۴۔ اسٹوڈرڈ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ان صدیوں میں اسلام کی صورت اتنی بری طرح سے مسخ کر دی گئی تھی کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں تو وہ اس بات سے انکار کر دیں گے کہ مسلمان انکی امت میں سے ہیں۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو THE NEW. WORLD OF. ISLAM (NEW. YARK) PP. 25.26

حاصل نہیں تھی اور نہ ان میں مذہبی پیشوا بننے کا سلیقہ اور نہ جوش ہی تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب کے دلدادہ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے رگ و پے میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر داخل ہو چکے تھے کہ اب ان کو اسلامی طرز معاشرت اور ہندو طرز معاشرت میں کوئی بین فرق نظر نہیں آتا تھا اور غیر اسلامی رسم و رواج پر جن کی بنیاد کفر اور شرک پر تھی عمل کرنے میں انھیں خوفِ خدا نہ ہوتا تھا۔ "عاقبت" کا لفظ ان کے لیے بے معنی تھا۔ مادیت، عیش پرستی، بادہ نوشی، غفلت شعاری اور حرکات ناشائستہ میں ملوث ہونا اور ان میں دلچسپی لینا ان کی زندگی کا واحد مقصد بن گیا تھا۔ شاہ عالم ثانی بذات خود اپنی ناعاقبت اندیشی کا اعتراف کرتا ہے۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے — شب دلارام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گزرتی ہے [۱]

اور امراء اور علماء کا طبقہ اپنے آقاؤں کے اچھے اور برے افعال کی کورانہ تقلید کرنا اپنا نصب العین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ بھی صدہا قسم کی اخلاقی بے راہ رویوں اور دینی گمراہیوں میں مبتلا تھا ان حالات میں جہلاء عوام کا ذکر کرنا ہی بیکار ہے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں گور پرستی اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ شاید ہی کوئی مزار ایسا ہو جہاں حاجت مندوں کا جم غفیر نہ جمع ہوتا ہو اور منتیں نہ مانتا ہو۔ زیارت قبور کو درجہ حج دیدیا گیا تھا اور انکو سجدہ گاہ بنالیا گیا تھا۔ مسجدیں ویران تھیں اور مسمار کی جارہی تھیں اور ہر طرح سے عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی جارہی تھی سودا نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں ایک مسجد کی زبوں حالی اور اس میں گدھے باندھنے کا یوں ذکر کیا ہے

قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھ کے اسمیں — بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جوان ہے
ملا جو اذان دیوے تو منہ موند کے اس کا — کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے
بولا جو خطیب اسمیں تو مارے اسے ایک جھول — ہاتھ آگیا واعظ تو تھپیڑا اد دہاں ہے
رہنگے ہو گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے — نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے [۲]

---

[۱] تذکرہ شعراء اردو امیر حسن دہلوی / ص ۴۰

[۲] کلیات سودا / ص ۳۶۵-۳۶۶

قرآن کی کوئی قدر و قیمت نہ رہی تھی

ہر یہ ہو اپانچ ٹکے گذری میں اگر یاقوت پکارے جو لکا قرآن ہے [۱]

مگر مزارات آباد تھے ہر سال عرس کے میلے لگتے تھے۔ نزدیک و دور سے زائرین آتے تھے۔ یہ زبوں حالی تھی کہ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"تم مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ [۲]

یہاں شمالی ہندوستان اور بالخصوص دہلی کے چند مزارات پر زائرین کے طرز عمل کا منظر پیش کیا جاتا ہے جس سے قارئین کو بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ یہ عہد گور پرستی کا عہد تھا اور ہندوستانی تہذیبی اثر میں اسلام اپنا ظاہری وجود بڑی حد تک کھو چکا تھا۔

قدم شریف دہلی میں یہ وہ مقام تھا جہاں حضرت سرور کائنات کے قدم شریف کا نشان تھا یہ مقام نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ یہاں کی خاک اہل بصیرت کے لئے سرمۂ چشم اور یہاں کا غبار راہ اہل فطرت کیلئے سرمایہ تسکین و راحت تھا۔ یہاں کے در و دیوار زائرین کے سجدوں سے ہر وقت منور رہتے تھے۔ یہاں خلقت ہر وقت سلام، درود اور تعظیم میں مصروف رہتی تھی جمعرات کے دن دہلی اور گرد و نواح کے لوگ قدم شریف کی زیارت کو آتے تھے۔ اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ لوگوں کو قدم شریف کی زیارت کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ تمام سال ہر جمعرات کو یہی حال رہتا تھا۔ ربیع الاول کے مہینہ میں بالخصوص اطراف و اکناف ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندوستان سے مشتاقان زیارت آتے تھے کوئی بیمار تھا جو تندرستی کا ارمان لیکر آیا تھا اور قدم شریف کی مٹی آنکھوں سے مل رہا تھا۔ کسی کی مراد دنیا تھی کسی کی آخرت اور کسی کے دل میں بال بچوں کی مرادیں تھیں قدم شریف کے احاطہ کا حوض شفا بخشی کیلئے مشہور تھا۔ تمام زائرین حوض کے پانی کو پیتے، آنکھوں سے ملتے اور بطور تبرک عزیز و اقربا کے لیئے اپنے گھروں کو لیجاتے تھے اور یہ بات باہیں عقیدہ تھی جو بیمار اس حوض کے پانی سے نہالیتا تھا وہ صحت مند ہو جاتا تھا۔ [۳] بارہ وفات کے دنوں میں ۵، ۷، ۹، ۱۱، اور ۱۲ تاریخ کو بہت بڑا میلہ

---

[۱] ایضاً ص ۶۶۳ [۲] تفہیمات الٰہیہ ماخوذ از تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۶۱ [۳] مرقع دہلی ص ۱۰۰ نیز تاریخ چہار گلشن محمد شاہی ص ۱۹ ب

لگتا تھا[1]

قدم شریف حضرت علی

درگاہ قلی خاں کا بیان ہے ”شنبہ کے دن لوگ فیض حاصل کرنے آتے ہیں ہر طرف سے مشتاقان زیارت آتے ہیں اور اپنی دلی آرزوؤں کے لیے دعائیں مانگتے ہیں نذریں چڑھاتے ہیں اور ہر شخص بامراد ہوتا ہے[2]

درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی

یہ مزار مقدس ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لیے قبلہ گاہ تھا حاجت مندوں اور تمنائیوں کی ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جمعرات کے دن خصوصیت سے بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ ربیع الاول کے مہینہ میں عرس ہوتا تھا۔ اس زمانے میں زیارتیں ہوتیں، مرادیں مانگی جاتیں اور نذریں چڑھتی تھیں[3] اس زمانے میں بھی عرس کے ایام کے علاوہ خواجہ معین الدین چشتی کے زائرین پہلے دہلی آتے ہیں، اور درگاہ بختیار کاکی میں پہلے حاضری دیتے ہیں اور انکے وسیلہ سے اجمیر شریف جاکر حاجت پوری ہونے کی منتیں مانگتے ہیں حضرت سلطان المشائخ کے مزار پر دہلی کے عوام و خواص زیارت کو جاتے تھے اور اب بھی یہ سلسلہ بدستور باقی ہے[4] شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مزار پر یکشنبہ کو دہلی کے زائرین حاضر ہوتے تھے۔ مسلمان اور ہندو دونوں مزار پر جاکر مرادیں مانگتے تھے۔ مزار کے قریب ایک چشمہ تھا اس کا پانی شفائے امراض کے لیے اکسیر کے مانند تھا جتنے بھی بیمار اس پانی سے غسل کرتے تھے سب کے سب شفا پاتے تھے اس وجہ سے دور دور سے مریض اس مزار پر آتے تھے اور غسل کرنے کے بعد صحت مند واپس جاتے تھے[5] علاوہ ازیں یہ بات عوام میں مشہور تھی کہ اگر لاولد میاں بیوی

---

[1] ہفت قلزم۔ ص ۲۴۔ [2] مرقع دہلی۔ ص ۳۔ [3] ایضاً۔ ص ۴۔ ۵، نیز ہفت گلشن محمد شاہی
گلشن محمد شاہی کا مگار خاں، ص ۸۔ ۷ [4] ”پھول والوں کی سیر“ نامی جشن ایک منت کے پوری ہونے کیوجہ سے وجود میں آیا برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ آجکل بہادر شاہ ظفر نمبر نومبر ۱۹۶۲ء) ص ۲۲۔ ۲۵
[4] مرقع دہلی۔ ص ۷، ہفت گلشن محمد شاہی ص ۹۰۔ ۹۱ [5] ایضاً ص ۷۔ ۸، تاریخ چہار گلشن محمد شاہی ص ۲ الف

اس میں غسل کر لیں تو اولاد ہو جاتی ہے۔ لہٰذہ جہاندار شاہ بادشاہ نے مع اپنی بیوی کے برہنہ اس چشمے میں غسل کیا تھا[1]

حضرت شاہ ترکمان بیابانی رجب کی ۲۳ ویں کو عرس ہوتا تھا۔ دہلی کے تمام باشندے شرکت کرتے تھے مزار پر پھول چڑھاتے تھے چراغاں کرتے تھے اور مرادیں مانگتے تھے نذریں چڑھاتے تھے دہلی کے تمام ساکنین کو آپکے مزار مبارک سے بے حد عقیدت تھی اور اپنی تمام مشکلات میں حضرت کا دامن پکڑتے تھے[2]

شاہ عزیز اللہ درگاہ قلی خاں کا بیان ہے کہ حاجتمند لوگ مزار پر جاتے ہیں یہ بات عقیدت مندوں میں مشہور ہے کہ کوئی شخص کبھی مایوس واپس نہیں جاتا[3]

نقش پنجہ حضرت شاہ مردان ہر شنبہ کو لوگ زیارت کو جاتے ہیں اور قریب کے حوض سے کوزوں میں پانی بھر کر بطور تبرک لے جاتے ہیں۔[4]

حاجی محمد الدین خلیفہ حضرت شہاب الدین سہروردی کی درگاہ — ہر سال لوگ انکے مزار پر برائے زیارت آتے تھے۔ طواف کرتے تھے اور اس فعل سے حج کا ثواب حاصل کرتے تھے۔[5]

بی بی زلیخا والدہ ماجدہ شیخ ابوالفضل علامی مزار آگرہ میں ہے۔ لوگ انکے مزار پر کلاوہ باندھتے ہیں[6]

بائیس خواجہ — بائیس اشخاص ایک جنگ میں شہید ہوئے تھے انکے مزار اٹاوہ میں ہیں ہر پنجشنبہ کو زائرین مزار پر حاضر ہوتے تھے[7]

ناصر الدین مزار سیالکوٹ میں ہے۔ برسات کے موسم میں لوگ برائے زیارت جاتے تھے[8]

ملتان میں کئی بزرگوں کے مزارات زیارت گاہِ خواص و عوام تھے مثلاً شیخ بہاء الدین ذکریا، شیخ رکن الدین[9][10]

---

[1] ہفت گلشن محمد شاہی ص ۳۹۳، ہفت قلزم "یکشنبہ کو مستورات نہانے آتی ہیں اور دیوالی کے دن بہت سی عورتیں جمع ہوتی ہیں" ص ۲۵ — [2] مرقع دہلی ص ۲۲-۲۵۔ [3] مرقع دہلی ص ۱۰-۱۱

[4] تاریخ چہار گلشن محمد شاہی ۱۹ ب، ہفت قلزم ص ۴۴ [5] ایضاً ص ۲۲ الف [6] ایضاً ص ۴۰ الف

[7] ایضاً ص ۴۱ الف [8] ایضاً ص ۴۳ ب [9][10] ۸۲-۱۱۱، ۱۲۶-۱۳۴ ابرار کے حالات ملاحظہ ہو۔ اذکار ابرار ص ۵۶-۵۵ سیر العارفین ص ۱۳۶-۱۲۸، تاریخ فرشتہ ا۔ ت، جلد دوم ۲۲-۴۳۳، خزینۃ الاصفیاء دوم ص ۱۹-۲۵

شیخ یوسف گردیزی[1]، شیخ موسیٰ گیلانی شمس الدین تبریزیؒ اور دیگر اولیاءاللہ کے مزارات اس شہر میں تھے لوگ ان مزاروں پر جاتے نذر و نیاز چڑھاتے اور حصول مراد کی منتیں مانگتے تھے[3]۔

شیخ بوعلی قلندرؒ کا مزار پانی پت میں اور شیخ بنوریؒ کا سنام میں زیارت گاہ خواص و عوام تھا[4]۔ شاہ شمس الدینؒ کا مزار دیپالی میں ہے چھوٹے بڑے سب آپ کے مزار کی زیارت کو جاتے تھے بھنڈاری کا بیان ہے۔

"در ہر شب جمعہ بالخصوص شب جمعہ ماہ نور خلایق کثیر مذکر و مؤنث از نزدیک و دور بطواف می آیند و نذرات نقد و جنس و شیر و برنج و مالیدہ روغن، و شکرامودی گزارند و ہر کدام باز روے حصول ماًمول نذری بندد و بارتو الہی مرادات حاصل می شود[5]"

تربت شیث | شہر لکھنؤ میں دیگر مزارات کے علاوہ حضرت شیث بن حضرت آدم و ایوب پیغمبر علیہم السلام کے مزارات تھے مسلمان زیارت کے لیے جاتے تھے[6]

درگاہ حضرت عباس[9] | لکھنؤ کے مسلمان مرد اور عورت کو حضرت عباسؓ کی درگاہ سے والہانہ عقیدت تھی اہلیہ میر حسن علی کا بیان ہے کہ بیماری سے شفا پانے، شدید بلاؤں، یا خطروں یا دوسرے حادثات جو مرہون منت ہونے کے جذبات پیدا کرتے ہیں؛ اس درگاہ کی طرف رجوع ہونے کے اسباب ہیں۔ لکھنؤ کے عوام اسی خیال سے وہاں جاتے ہیں[10]

اس ضمن میں بہادر شاہ ظفر کی علالت کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ شاہ عباسؓ کی منت ماننے کے طفیل میں بادشاہ کو شفا حاصل ہوئی۔ مگر سنی مسلمانوں نے اس پر شیعہ ہونیکا الزام عائد کر دیا جسکی وجہ سے بادشاہ

---

[1] متوفی ۱۳۲ھ۔ برائے حالات۔ اذکار ابرار ص ۵۸-۶۰، سیر العارفین ص ۱۴۰، تاریخ فرشتہ (ا۔ت) جلد دوم ص ۶۳۶-۶۳۹ خزینۃ الاصفیا-۲/ص ۴۷-۵۱ [2] متوفی ۱۵۲ھ۔ آب کوثر ص ۸۳۔ [3] خزینۃ الاصفیا ۲/ص ۲۶۸-۲۷۰۔ [4] خلاصۃ التواریخ ص ۶۱-۶۲ [5] متوفی ۱۳۲۴ھ۔ برائے حالات اذکار ابرار ص ۱۰۰-۱۰۱، بزرگان پانی پت ص ۲۹-۱۶۹ [6] خلاصۃ التواریخ ص ۲۴-۳۵۔ [7] اذکار ابرار ص ۸۸-۹۱۔ [8] خلاصۃ التواریخ ص ۶۸۔ [9] خلاصۃ التواریخ ص ۴۳ نیز مجموعہ مثنویات میر حسن ص ۱۵۹، [9] نام ابوالفضل عباس تھا آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دوسری بیوی ام البنین کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور اسی طرح حضرت حسین کے سوتیلے بھائی تھے عمادۃ السعادت ۲۷، افتتاح التواریخ ص ۲۷ سنہ ... کی تفصیل ملاحظہ ہو

OBSERVATIONS. 1. PP. 62-66.

کو بڑی تشویش ہوئی اور اس کو اس بات کی تردید کرنی پڑی۔ یہ واقعہ یوں تھا کہ ایک مرتبہ بادشاہ سخت بیمار پڑ گیا اور طرح طرح کے علاج معالجے ہوئے مگر کوئی افاقہ نہ ہوا اتفاق سے اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ بن کام بخش، بن مرزا سلیمان شکوہ بھی لکھنؤ سے دہلی آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے ان کا عقیدہ اثنا عشری تھا مایوسی کے عالم میں مرزا حیدر شکوہ کے مشورہ سے ان کو خاک شفا دی گئی اور بادشاہ کو صحت حاصل ہوئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ اگر صحت یاب ہو گئے تو وہ حضرت عباس کی درگاہ پر علم چڑھائیں گے چنانچہ لکھنؤ پہونچکر انہوں نے بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ ان کا اتنا مقدور نہیں کہ نذر ادا کر سکیں۔ لہذہ حضور مدد فرمائیں۔ بہادر شاہ نے کچھ روپے بھیجے اور مرزا حیدر شکوہ نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا جس میں اودھ کے تمام شاہی خاندان کے افراد، امراء و علماء سب ہی شریک ہوئے۔ اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے علم چڑھایا گیا[۱]

---

[۱] یادگار غالب از خواجہ الطاف حسین حالی (لاہور ۱۹۶۳ء) ص ۱۱۲-۱۱۳

خلفائے راشدین

اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

اس کتاب میں خلفائے برحق اور اہل بیت کرام کے مخلصانہ تعلقات کی جھلک ایک خاص انداز میں دکھائی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں بکھرے ہوئے جواہر پاروں کو اس خوبی سے یکجا گیا ہے کہ خلافت راشدہ کا مبارک دور نگاہوں میں گھوم جاتا ہے اور ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو حقیقی زندگی کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں۔

مشہور و معروف عالم و محقق علامہ زمخشری کی "الموافقة بين اهل بيت والصحابة" کا صاف و سلیس ترجمہ ہے۔ مترجم: مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی

صفحات ۱۴۸ قیمت مجلد ایک روپیہ پچھتر پیسے ۱/۷۵

مکتبہ برہان۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶